بقیہ اشارات

اور ان کی بندوق کا رُخ یہودیوں کی طرف کہیں اُس وقت جا کر مڑا جب آغازِ جنگ سے چند روز پہلے شاہ حسین نے خود مصر پہنچ کر جمال عبدالناصر کے ساتھ دفاعی اتحاد کا معاہدہ کیا۔

سعودی عرب کے حالات اگرچہ دینی اعتبار سے مصر اور شام کی بہ نسبت بدرجہا بہتر ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس ملک کے فرمانروا دین کے لیے جو کچھ کر سکتے تھے اس کا عشرِ عشیر بھی انہوں نے نہیں کیا۔ ان پر دین کا سب سے زیادہ حق تھا، کیونکہ سعودی خاندان کو دین ہی کی بدولت اقتدار نصیب ہُوا۔ ان کو اللہ نے حرمین شریفین کی خدمت کا موقع عطا فرمایا۔ ان پر اس نے دولت کی وہ بارش کی جو کبھی ان کے اور کسی عرب کے خواب و خیال میں بھی نہ آئی تھی۔ لیکن پچھلے ۲۰ سال کے دوران میں مغربی تہذیب ایک سیلاب اور طوفان کی طرح ان کی مملکت میں پھیلتی رہی اور اسے روکنے کے لیے کوئی مُوثر تدابیر اختیار نہیں کی گئیں۔ اس ملک کو دنیائے اسلام میں تقدس کا جو مقام حاصل ہے اس کی بنا پر وہ بڑی آسانی کے ساتھ پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک رہنما قوت بن سکتا تھا۔ لیکن اس معاملے میں اس نے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی وہ کوشش نہیں کی جو وہ فی الواقع کر سکتا تھا۔ ایک طرف محلاتی سازشوں اور رقابتوں کی وجہ سے مال اور وقت کا بڑا حصّہ ضائع ہوتا رہا۔ دوسری طرف خدا کی دی ہوئی دولت کو بے دریغ عیش و عشرت اور شان و شوکت پر صرف کیا جاتا رہا۔ اور جو ذرائع و وسائل ملک کی معاشی اور فوجی طاقت کو مضبوط بنانے کے لیے استعمال ہونے چاہییں تھے وہ اسراف و تبذیر کی نذر ہوتے رہے۔

اسی نمونے پر آس پاس کی ان چھوٹی چھوٹی عرب ریاستوں کے شیوخ بھی چل پڑے جن کی زمین پے در پے تیل کی دولت اگلتی رہی۔ ان کی شاہ خرچیوں کی جو تفصیلات یورپ کے اخبارات میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہی ہیں، دشمن ان کا مذاق اڑاتے رہے ہیں اور مسلمانوں کی گردن شرم سے جھک جاتی رہی ہے۔

ان چیزوں کو پڑھ کر آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس قسم کی مُسرفانہ عادات کے ساتھ کیا کوئی قوم دنیا میں بلا ذیادہ دیر تک زندہ رہ سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین میں تیل کے چشمے رواں کیے جن سے بے تحاشا دولت اُبل رہی ہے۔ مگر اس دولت سے اللہ کے دین کی آبیاری کرنے اور اپنی معاشی و فوجی طاقت بنانے کے بجائے اسے عیاشیوں میں بے دریغ بہایا جا رہا ہے۔ جس شیخ کا جب جی چاہتا ہے دو دو ہزار خدام اور خادماؤں کے ساتھ یورپ کا رُخ کر لیتا ہے اور وہاں ایک ایک دن میں لاکھوں روپے صرف ہوٹلوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ان ممالک کی دولت کا بیشتر حصہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس میں خرچ ہوتا ہے اور وہاں کے دولتمند یہودی اسی مال کو پھر اسرائیل کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ بنک آف انگلینڈ کا تو استحکام ہی کویت کا رہین منت ہے۔

افسوس! جو ۲۰ سال کی مہلت اللہ تعالیٰ نے عربوں کو دی تھی وہی اس نے اسرائیل کو بھی عطا کی تھی۔ اس مدت میں اسرائیل اپنی سیاسی، معاشی اور فوجی قوت بناتا چلا گیا۔ اور عرب اپنی قوتیں کچھ نفس پروری میں اور کچھ نمائشی کاموں میں، اور کچھ آپس کی کشمکش میں ضائع کرتے رہے۔ انہوں نے کبھی یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش نہیں کی کہ ان کی بغل میں بیٹھا ہوا دشمن کیا تیاریاں کر رہا ہے، کتنی طاقت اس نے فراہم کر لی ہے، اور کیا اسباب ہیں جو اسے طاقتور بنا رہے ہیں۔

یہ تو ہیں ان ممالک کے دینی اور سیاسی حالات جہاں تک ان کے فہم و بصیرت کا تعلق ہے اُس کے متعلق بھی کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ ہر ملک نکمے کھلاڑی کی طرح خود نمائی کے جذبے میں سرشار اکیلا سکور کرنے کے درپے ہے۔ اُسے دنیائے اسلام یا دنیائے عرب کے مسائل سے زیادہ اپنی قیادت و سیادت قائم کرنے کی فکر دامنگیر رہتی ہے اور اس نشہ نے بعض ممالک میں جنوں کی سی کیفیت اختیار کر لی ہے۔ اس بنا پر وہ کوئی ایسی بات خواہ وہ کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو، سننے پر آمادہ نہیں ہوتے جس سے اُن کی قیادت اور برتری کا اظہار نہ ہوتا ہو۔ اگر پوری دنیائے اسلام ایک صحیح بات پر متفق ہوتی نظر آتی ہو تو یہ اُس کی مخالفت کرنا اپنا فرض منصبی خیال کریں گے۔ ہم یہاں

اس کی ایک دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔

سعودی عرب کی طرف سے شاہ فیصل نے مسلمانوں کے اتحاد کی تحریک شروع کی اور اس سلسلے میں عرب اور مسلمان ریاستوں کو بعض ایسے مفید مشورے دیئے گئے جن سے سب کو بہت زیادہ فائدہ حاصل ہو سکتا تھا۔ اُن سے کہا گیا کہ مسئلہ فلسطین کو صرف عربوں کا مسئلہ بنانے کے بجائے دنیائے اسلام کا مسئلہ بنایا جائے تاکہ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ ممالک کی تائید حاصل کی جا سکے۔ تمام مسلمان ممالک کے لیے اقتصادی لحاظ سے جامع منصوبہ بندی کی جائے اور باہمی تعاون سے ان سارے ممالک کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں۔ پھر ثقافتی اور مذہبی معاملات میں مسلمانوں کے لیے ایک مشترکہ لائحہ عمل تیار کیا جائے اور مغربی تہذیب کی یلغار کو متحد ہو کر روکا جائے۔ ظاہر بات ہے کہ اس تحریک میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے کسی مسلمان ملک کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ مگر مصر اور شام دونوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور لوگوں کو یہ باور کرانے کے لیے پورا زور صرف کر دیا کہ یہ سب کچھ مغربی استعمار کے اشارے پر کیا جا رہا ہے اور یہ تحریک سامراجیوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے اٹھائی گئی ہے بعینہ یہی پروپیگنڈا ماسکو سے بھی اتحاد عالم اسلامی کے خلاف کیا جا رہا تھا۔

پھر دیکھیے کہ تمام عرب ممالک ۱۹۶۵ء تک عرب سربراہوں کی کانفرنس کا کسی حد تک احترام کرتے رہے اور اس وجہ سے ان کا کچھ تھوڑا بہت بھرم قائم رہا۔ آخری کانفرنس ۱۹۶۵ء میں کاسابلنکا کے مقام پر ہوئی اور اس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اسرائیل کے خلاف کامیابی کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تمام عرب ممالک اپنے داخلی اختلافات ختم کر کے اور پوری طرح متحد ہو کر سرگرم عمل ہوں لیکن اس فیصلے کے فوراً بعد ہی مصر اور شام کی طرف سے اسے ٹھکرایا جانے لگا۔ چنانچہ ۱۹۶۶ء میں جب اسرائیل نے اردن کی بستی السموع پر حملہ کیا تو تمام عرب ملکوں نے اس کی مذمت کی مگر انہیں یہ توفیق نصیب نہ ہوئی کہ وہ ایک جگہ سر جوڑ کر کوئی متفقہ راہ عمل اختیار کر سکیں۔

اسی کاسابلنکا کانفرنس کے سلسلے میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ جب اس میں کشمیر کے بارے میں

قرارداد منظور کی جانے لگی تو مصر نے شدید مخالفت کی۔ وہ تو بھلا ہو شاہ فیصل، عبدالسلام عارف مرحوم اور شاہ حسین کا کہ انہوں نے اس موقع پر بڑی جرأت مندی کا ثبوت دیا اور اس قرارداد کو کسی نہ کسی طرح پاس کروا لیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جمال عبدالناصر صاحب مسلمان ملکوں کے ساتھ یک طرفہ ٹریفک چلانا چاہتے ہیں۔ ان کا منشا یہ ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آئے تو سب مسلمان ان کی مدد اور حمایت کریں مگر جب کسی مسلمان ملک پر مصیبت آئے تو وہ ان کے حق میں ایک کلمۂ خیر بھی نہ فرمائیں۔ اس سے بڑھ کر تدبر کا دیوالیہ پن اور کیا ہو سکتا ہے۔

اسرائیل مشرق وسطیٰ کو ہڑپ کر جانے کے لیے دستت تیاریاں کر رہا تھا اور وہ اسلحہ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے علاوہ دنیا کے تمام چھوٹے بڑے ممالک کو اپنا مؤید بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہا تھا۔ مگر مشرقِ وسطیٰ کے بدنصیب ممالک کا یہ حال تھا کہ عین اُس وقت بھی جبکہ جنگ کے شعلے ہر وقت بھڑکنے کے لیے تیار تھے، ان کی کوئی مشترکہ کانفرنس نہ کی گئی، ان کا کوئی متحدہ لائحۂ عمل نہ بنایا گیا، اور ان کی فوجوں کے درمیان تعاون و توافق کی کوئی صورت پیدا نہ کی گئی۔ مصر اور شام دوسروں کے تعاون سے بے نیاز ہو کر خود ہی اسرائیل کا مقابلہ کرنے کا دم داعیہ لیے بیٹھے رہے، اور دنیا کو یہ لاف زنی سناتے رہے کہ ہم چار گھنٹوں میں اسرائیل کا تیاپانچا کر کے رکھ دینگے۔ اُردن کے شریف اور وسیع الظرف فرمانروا نے خود مصر جا کر دستِ تعاون دراز کیا۔ سعُودی عرب نے بھی خود آگے بڑھ کر امداد کی پیشکش کی۔ سوڈان الجزائر، اور مراکش نے بھی خود اپنی فوجیں روانہ کیں۔ مگر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ عین آغازِ جنگ کے وقت جہاں مختلف ممالک کی فوجیں یکایک اکٹھی ہو جائیں وہاں کوئی معرکہ آخر کیسے سر کیا جا سکتا ہے۔

دنیائے اسلام کا کوئی ملک ایسا نہیں جس نے اس معاملے میں مشرقِ وسطیٰ کی پُوری پوری حمایت نہ کی ہو۔ خصوصاً ترکی نے تو اس معاملے میں اسلامی اخوت کا بہت بڑا مظاہرہ کیا اور اپنی ساری تلخیاں بھول کر عربوں کے موقف کی تائید کی۔ اسی طرح ایران نے بھی اس بات کو بھلا دیا کہ آغازِ جنگ تک اسے گالیاں دی جاتی رہی تھیں اور اس پر اسرائیل کی مدد کے الزامات لگائے جاتے رہے تھے۔ اسلامی اخوت کا تقاضا

کرکے اس نے یہ سب کچھ فراموش کر دیا اور عربوں کی کھلم کھلا حمایت کی۔ مگر اس شخص کی دانائی و ہوشمندی کی داد کس طرح دی جائے جس نے کبھی یہ نہ سوچا کہ اس کے دوست اور خیر خواہ اگر ہو سکتے ہیں تو مسلمان ہی ہو سکتے ہیں۔ سو وہ دوستوں کو ٹھکراتا رہا اور اس روس پر بھروسا کرتا رہا جس نے عین وقت پر دغا دیکر دکھا دی۔

ایک طرف نہ صرف عرب ممالک بلکہ پوری دنیائے اسلام امداد کے لیے بیتاب تھی مگر دوسری طرف یہ عالم تھا کہ کسی ایک جگہ مل بیٹھ کر صلاح مشورے کے لیے بھی آمادگی نہ پائی جاتی تھی اور اس مہم کو صرف روس کی امداد کے بھروسے پر سر کرنے کا ارادہ کیا جا رہا تھا۔ تمام مسلمان ممالک سے مشاورت تو خیر بڑی بات ہے کرنل ناصر صاحب کی انانیت نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ صرف عرب ممالک ہی سے مشورہ کرکے کوئی مشترکہ لائحہ عمل تیار کر لیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ روس پر اندھے اعتماد نے انہیں ہر دوسری قوت سے بالکل بے نیاز بنا دیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ تنہا یہ معرکہ سر کرکے ہیرو بن جائیں۔ حد یہ ہے کہ لڑائی شروع ہو جانے کے بعد جب سارے ممالک نے از خود حق و انصاف اور اسلامی اخوت کے تقاضوں کے پیش نظر اپنے سارے اختلافات ختم کرکے ناصر صاحب کی سربراہی میں اسرائیلی جارحیت کا مقابلہ شروع کیا تو اس وقت بھی انہوں نے اُن کی کسی تجویز یا مشورے کو قبول نہ کیا۔ مراکش اس موقع پر بار بار یہ کہتا رہا کہ عرب سربراہوں کی کانفرنس بلا کر کوئی مشترکہ منصوبہ تیار کر لیا جائے مگر اُس کی بالکل شنوائی نہ ہوئی۔ بالآخر ۸ جون کو عرب وزرائے خارجہ کی ایک کانفرنس کویت میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا مگر ظاہر ہے کہ یہ باتیں بعد از وقت تھیں۔

دورِ جدید میں جنگ کرنے اور پھر اُسے کامیابی کے ساتھ جیتنے کے لیے دوسرے تقاضوں کے علاوہ ایک نہایت ضروری تقاضا یہ بھی ہے کہ آپ اپنے موقف کی صحت کے بارے میں پوری دنیا کو آگاہ کریں اور نشر و اشاعت کے وسیع ذرائع استعمال کرکے دنیا کی رائے عام کو مطمئن کر دیں کہ آپ برسرِ حق ہیں اور آپ کا دشمن سراسر زیادتی کر رہا ہے۔ اس غرض کے لیے یہ ضروری تھا

کہ دنیا کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں تفصیل کے ساتھ بہت بڑے پیمانے پر فلسطین کے اصل مسئلے کو پیش کیا جاتا۔ یورپ، امریکہ، ایشیا، افریقہ، غرض ہر براعظم کے عوام کو بتایا جاتا کہ ایک قوم کے وطن میں زبردستی دوسری قوم کا وطن پیدا کر کے کتنی بڑی زیادتی کی گئی ہے۔ ناقابلِ انکار حقائق سامنے لا کر یہ ثابت کر دیا جاتا کہ اسرائیل کا وجود بجائے خود ایک ظلم اور جارحیت ہے جسے دفع کرنے میں عرب بالکل حق بجانب ہیں۔ لیکن اس معاملہ میں بھی عربوں کا پروپیگنڈا بہت کمزور رہا ہے اور یہودیوں نے اپنے پروپیگنڈا کے زور سے کم از کم غیر مسلم دنیا کی رائے عام کو اتنا متاثر کر لیا ہے کہ وہ ان ظالموں کو الٹا مظلوم، اور عرب مظلوموں کو الٹا ظالم سمجھنے لگی ہے۔ عرب صرف عربی زبان میں نشر و اشاعت کر کے یہ سمجھتے ہے کہ انہوں نے اپنا مقدمہ دنیا کے سامنے بخوبی رکھ دیا ہے۔ حالانکہ انگریزی، جرمن، فرنچ اور دنیا کی دوسری بڑی زبانوں میں ان کا پروپیگنڈا یہودی پروپیگنڈے کے مقابلے میں ایک فی صد بھی نہیں ہے۔

اس جنگ میں دنیائے اسلام نے بلاشبہ بہت کچھ کھویا ہے۔ غزہ اور جزیرہ نمائے سینا، دریائے اردن کے مغرب میں فلسطین کا وہ پورا علاقہ جو ۱۹۴۹ء میں بچا رہ گیا تھا، قدیم بیت المقدس اور بحیرہ طبریہ کے مشرق اور شمال کا اچھا خاصا علاقہ یہودیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں۔ ہزارہا خاندان تباہ و برباد ہوئے۔ بے حساب ساز و سامان کا نقصان ہوا۔ اور نہ صرف عرب بلکہ پوری دنیائے اسلام کے وقار اور ساکھ کو شدید صدمہ پہنچا۔ بے شک یہ ایک بڑا المناک سانحہ ہے لیکن اگر یہ ہولناک نتائج دنیائے اسلام کی آنکھیں کھولنے کا باعث بن سکیں تو پھر بھی ہم یہ سمجھیں گے کہ ہمارا کچھ نہیں بگڑا۔ قوموں پر ایسے حادثات آتے ہی رہتے ہیں اور انہیں اس قسم کے نقصانات برداشت کرنے ہی پڑتے ہیں۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی یہ شکست فتح کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے اگر وہ اس سے عبرت حاصل کر کے اپنے طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں تبدیلی پیدا کریں اور اپنے دوست اور دشمن کے درمیان تمیز کر کے اپنے معاملات کو سلیقے، صبر، عزم و ہمت اور اتحاد کے ساتھ طے کرنے کے ڈھنگ سیکھ سکیں۔

اوّلاً، اس بحران نے اس حقیقت کو پوری طرح آشکارا کر دیا ہے کہ مسلمانوں کو متحد ہوئے بغیر کوئی چارہ

نہیں۔ اسلامی اخوت کا رشتہ ہی سب سے زیادہ پائیدار اور مضبوط ہے اور اس کے مقابلے میں دوسرے سب رشتے تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔ ترکی، پاکستان، ایران، افغانستان اور دوسرے غیر عرب مسلمان ممالک نے جس طرح سے عربوں کا ساتھ دیا ہے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اسلامی اخوت میں اب بھی بے پناہ طاقت موجود ہے۔ ہمیں قوت و طاقت کے اس اتھاہ خزانے سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

دوسرے، اس جنگ نے اس حقیقت کو بھی پوری طرح واضح کر دیا ہے کہ کفر کے اپنے گھر میں خواہ کتنے شدید اختلافات ہوں، مگر اسلام اور مسلمانوں کی بربادی کے معاملے میں اُن کے اندر کامل اتفاق اور اتحاد پایا جاتا ہے۔ اس لیے ان میں سے کسی ایک پر بھی بھروسا کرنا بُری نا عاقبت اندیشانہ روش ہے۔ مغربی الحاد اور اشتراکیت، امریکہ، برطانیہ، فرانس اور روس خواہ آپس میں کتنے ہی دست و گریباں ہوں مگر اسلام کی مخالفت میں بالکل متفق اور متحد ہیں۔

تیسرے، مسلمانوں کے اندر نہ تو کوئی ایسی آئیڈیالوجی مقبول ہو سکتی ہے جو اسلام سے متصادم ہو اور نہ کوئی ایسا نظریہ پنپ سکتا ہے جو دین کی ضد ہو۔ جو دین ایک قوم کے رگ و پے میں سرایت کر کے اُس کی جڑیں نہایت گہری اتار چکا ہو اُسے محض قوت کے بل بوتے پر اکھاڑ پھینکنے کی کوشش بہت بڑی حماقت ہے۔ اسلام آج بھی اس ملت کی قوت و طاقت کا واحد سرچشمہ ہے مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو فکر و عمل کی کوتاہی کے باوجود اس پر اب بھی اعتقاد ہے۔ اس عظیم قوت کو نظر انداز کر کے باطل نظریات کو فروغ دینا بالکل پاگل پن ہے۔ چنانچہ اس وقت پوری دنیائے اسلام کی نجات اسی میں ہے کہ جس دین کے ساتھ وہ غیر شعوری محبت اور عقیدت رکھتے ہیں اس کے ساتھ اُن کا شعوری اور ارادی تعلق پیدا کیا جائے اور اُس کے تقاضوں کے مطابق نہ صرف انہیں زندگی بسر کرنے کی تلقین کی جائے بلکہ اس کے لیے انہیں مناسب ماحول اور سازگار فضا مہیا کی جائے۔

چوتھے، قدرتی وسائل کے اعتبار سے مسلمان قوم کوئی غریب اور مفلس قوم نہیں ہے کہ دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کیے بغیر اس کا زندہ رہنا ناممکن ہو۔ اس ملت کو اللہ تعالیٰ نے بڑے

قیمتی ذرائع و وسائل دیئے ہیں۔ اس بنا پر اس کا فرض ہے کہ باری تعالیٰ کے ان عطیات کو اُس کے احکام کے مطابق استعمال کرے اور انہیں ایک مخصوص طبقہ کی میراث سمجھ کر اس کی عیش پرستیوں کے لیے انہیں مختص نہ کر دے۔

ان اصولی باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کے مختلف ممالک کے اندر ایسی قیادت کو اُبھارا جائے جو مسلمانوں کی ملی امنگوں کی پوری طرح ترجمان ہو اور اس کے دینی تقاضوں کو پورا کرنے کا عزم اور ارادہ رکھتی ہو۔ غیر دینی نظریات کو پروان چڑھانے کے لیے جو لوگ طاقت کے بل بوتے پر برسرِ اقتدار آجاتے ہیں وہ اس ملت کی کوئی ٹھوس خدمت نہیں کر سکتے بلکہ قوم کی صلاحیتوں کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے کے بجائے انہیں باہمی سرپھٹول میں ضائع کرنے کا موجب بنتے ہیں۔

مسلمانوں کو نشر و اشاعت کے لیے ایک مضبوط ملی ادارے کے قیام کی بھی فکر کرنا چاہیے کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنے موقف سے دنیا کو صحیح طور پر آشنا نہیں کر سکتے۔

چراغِ راہ کا سوشلزم نمبر عنقریب منظرِ عام پر آ رہا ہے۔ یہ نمبر جس کے لیے چوٹی کے ملکی و غیر ملکی مفکرین کا تحریری تعاون حاصل کیا گیا ہے، انشاء اللہ اپنے موضوع پر ایک یادگار دستاویز ہو گا۔
اس نمبر کو پانچ حصّوں پر تقسیم کیا گیا ہے:

حصّہ اوّل:۔ اشتراکیت کا علمی مطالعہ۔ حصّہ دوم: اشتراکی تحریک۔
حصّہ سوم: اشتراکیت عمل کی تجربہ گاہ میں۔ حصّہ چہارم: بین الاقوامی جائزے۔
حصّہ پنجم: اشتراکیت اور اسلام۔ حصّہ ششم۔ اشتراکیت اور ادب
حصّہ ہفتم: اشتراکیت اپنوں اور دوسروں کی نظر میں حصّہ ہشتم: اشتراکی لٹریچر۔
حصّہ نہم:۔ مسائل کا حقیقی حل۔

مجوزہ ضخامت: ۵۰۰ صفحات۔ قیمت: ۶ روپیہ۔ سالانہ خریداروں کے لیے رعایتی قیمت: ۳ روپیہ۔